

# روشنى اے روشنى

## کلياتِ شکيب جلالى

شکيب جلالى

## عرض ناشر

اس مجموعے کا نام ”روشنی اے روشنی“ خود شکلیب مرحوم کا تجویز کردہ ہے۔

شکلیب کے انتقال کے چند روز بعد ان کی بیوہ کی طرف سے مجھے کاغذات کا ایک انبار موصول ہوا جو شکلیب کے کلام کے تراشوں اور ان کی چند نامکمل بیاضوں پر مشتمل تھا۔ ان کے مطالعے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ شکلیب کے ابتدائی کلام کا انتخاب نہایت ضروری ہے۔ ساتھ ہی مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ شکلیب کے آخری پانچ چھ برس کے کلام میں سے کوئی غزل یا نظم رہ نہ جائے۔ کیونکہ یہی وہ دور ہے جب شکلیب کی شاعرانہ عظمت صورت پذیر ہونے لگی تھی۔ اس کام میں بہت دن صرف ہو گئے اس کے بعد ملکی حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا کہ ماحول تخلیقی ادب کے کسی بھی مجموعے کی اشاعت کے لیے سازگار نہ رہا؛ چنانچہ ”روشنی اے روشنی“ کی اشاعت ملتوی ہوتی رہی۔ اب بھی اشاعتی اور طبقاتی صورت حال کچھ ایسی ہمت افزا نہیں ہے۔ مگر شکلیب کے مجموعہ کلام کی اشاعت میں مزید تاخیر ناقابل برداشت تھی اس لیے یہ مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے جملہ حقوق اشاعت و اخذ و ترجمہ شکلیب کی بیوہ محترمہ محدثہ خاتون کے حق میں

جملہ حقوق بحق محترمہ محدثہ خاتون  
بیوہ شکلیب جلالی مرحوم محفوظ ہیں

محفوظ ہیں۔

قارئین سے استدعا ہے کہ اگر اس کے مطالعے کے بعد  
انہیں محسوس ہو کہ شکلیب کی کوئی اہم غزل یا نظم مجموعے میں شامل نہیں  
ہو سکی، تو اس کی نقل بھجوا کر ممنون کریں تاکہ آئندہ اشاعت میں یہ کمی  
پوری کر دی جائے۔

احمد ندیم قاسمی

یکم جولائی ۱۹۷۲ء

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں  
حدِ ودِ وقت سے آگے گیا ہے کوئی

## غزلیات

- ۱۔ گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
- ۲۔ آ کے پتھر تو مڑے صحن میں دو چار گرے
- ۳۔ شفق جو رُوئے سحر پر گلال ملنے لگی
- ۴۔ وہی جھکی ہوئی سیلیں، وہی دریچہ تھا
- ۵۔ خزاں کے چاند نے پوچھا یہ جھک کے کھڑکی میں
- ۶۔ وہ دُوریوں کا رہ آ ب پر نشان گھلا
- ۷۔ آیا ہے ہر چڑھائی کے بعد اک اتار بھی
- ۸۔ کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
- ۹۔ درد کے موسم کا کیا ہوگا اثر انجان پر
- ۱۰۔ میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
- ۱۱۔ ہم جنس اگر ملے نہ کوئی آسمان پر
- ۱۲۔ غم دل جیٹ، تحریر میں آتا ہی نہیں
- ۱۳۔ وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
- ۱۴۔ تیز آندھیوں میں اڑتے پروبال کی طرح
- ۱۵۔ جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
- ۱۶۔ پھر سُن رہا ہوں گزرے زمانے کی چاپ کو
- ۱۷۔ خموشی بول اٹھے، ہر نظر پیغام ہو جائے
- ۱۸۔ یادیں ہیں اپنے شہر کی اہل سفر کے ساتھ

- ۱۹۔ اس بُت کدے میں تو جو حسین تر لگا مجھے
- ۲۰۔ مَر جھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ
- ۲۱۔ ساحل تمام اشکِ ندامت سے اٹ گیا
- ۲۲۔ عشق پیشہ نہ رہے داد کے حقدار یہاں
- ۲۳۔ اُتریں عجیب روشنیاں رات خواب میں
- ۲۴۔ کیا کہیے کہ اب اُس کی صدا تک نہیں آتی
- ۲۵۔ جب تک غم جہاں کے حوالے ہوئے نہیں
- ۲۶۔ جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا
- ۲۷۔ ملا نہیں اذنِ رقص جن کو کبھی تو وہ بھی شرار دیکھو
- ۲۸۔ غمِ الفت مرے چہرے سے عیاں کیوں نہ ہوا
- ۲۹۔ منظر تھا اک اُجاڑنگا ہوں کے سامنے
- ۳۰۔ اب آپ رہ دل جو کشادہ نہیں رکھتے
- ۳۱۔ جو بھی ہے طالبِ یک ذرہ، اسے صحرا دے
- ۳۲۔ موجِ غم اس لیے شاید نہیں گزری سر سے
- ۳۳۔ تو نے کیا کیا نہ اے زندگی دشتِ ودر میں پھرایا مجھے
- ۳۴۔ اُتر گیا تن نازک سے پستنیوں کا لباس
- ۳۵۔ اس خاکداں میں اب تک باقی ہیں کچھ شر سے
- ۳۶۔ اب میسر نہیں فرصت کے وہ دن رات ہمیں
- ۳۷۔ آگ کے درمیان سے نکلا
- ۳۸۔ وہ سامنے تھا پھر بھی کہاں سامنا ہوا
- ۳۹۔ تارے ہیں نہ ماہتاب یارو

- ۲۱۔ دیکھتی رہ گئی مخرابِ حرم  
 ۲۲۔ دنیا والوں نے چاہت کا مجھ کو صلہ انمول دیا  
 ۲۳۔ برگِ دل کی طرح ہے زرد ہوا  
 ۲۴۔ روشن ہیں دل کے داغ نہ آنکھوں کے شب چراغ  
 ۲۵۔ یہ جلوہ گاہِ ناز تماشا نیوں سے ہے  
 ۲۶۔ دل میں لرزاں ہے تراشعلہ رخسار اب تک  
 ۲۷۔ دشتِ صحرا اگر بسائے ہیں  
 ۲۸۔ جس قدر خود کو وہ چھپاتے ہیں  
 ۲۹۔ چوٹ ہر گام پہ کھا کر جانا  
 ۷۰۔ پاس رہ کر بھی بہت دُور ہیں دوست

- ۴۰۔ سمجھ سکو تو یہ تشنہ لبی سمندر ہے  
 ۴۱۔ اب یہ ویران دن کیسے ہوگا بسر  
 ۴۲۔ دتکیں دیتی ہیں شب کو درِ دل پر یادیں  
 ۴۳۔ کون جانے کہاں ہے شہرِ سگلوں  
 ۴۴۔ کہاں رُکیں گے مسافر نئے زمانوں کے  
 ۴۵۔ موجِ صبارواں ہوئی رقصِ جنوں بھی چاہیے  
 ۴۶۔ آئینہ جذباتِ نہاں ہیں تری آنکھیں  
 ۴۷۔ پردہ شب کی اوٹ میں زہرہ جمال کھو گئے  
 ۴۸۔ رعنائی نگاہ کو قالب میں ڈھالیے  
 ۴۹۔ ہوئے شب سے نہ بچتے ہیں اور نہ جلتے ہیں  
 ۵۰۔ شاخو بھری بہار میں رقصِ برہنگی  
 ۵۱۔ حسنِ فردا غمِ امروز سے ضو پائے گا  
 ۵۲۔ مجھ سے ملنے شبِ غم اور تو کون آئے گا  
 ۵۳۔ مانندِ صبا جھڑ گئے ہم  
 ۵۴۔ ساحل سے دور جب بھی کوئی خواب دیکھتے  
 ۵۵۔ بیٹھے چشموں سے خنک چھاؤں سے دور  
 ۵۶۔ کچھ دن اگر یہی رہا دیوار و درکارنگ  
 ۵۷۔ ہر ایک بات ہے منت کشِ زباں لوگو  
 ۵۸۔ ہم آج ہیں پھر ملول یارو  
 ۵۹۔ باقی ہے یہی ایک نشاں موسمِ گل کا  
 ۶۰۔ کوئی دیکھے تو سہی یارِ طر حدار کا شہر

## نظمیں

- ۱۔ پاداش
- ۲۔ اندمال
- ۳۔ جہت کی تلاش
- ۴۔ دلاسا
- ۵۔ یاد
- ۶۔ جاگتی آنکھیں
- ۷۔ گریز پا
- ۸۔ لرزتا دیپ
- ۹۔ سفیر
- ۱۰۔ انفرادیت پرست
- ۱۱۔ عکس اور میں
- ۱۲۔ دعوتِ فکر
- ۱۳۔ زاویے
- ۱۴۔ ہمارا دور
- ۱۵۔ شہرِ گل
- ۱۶۔ خداوندانِ جمہور سے
- ۱۷۔ نئی کرن
- ۱۸۔ جشنِ عید

- ۱۹۔ لہو ترنگ
- ۲۰۔ عید کی بھیک
- ۲۱۔ بنام اہل چمن



گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا  
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

ستارے سسکیاں بھرتے تھے اوس روتی تھی  
فسانہ جگر لخت لخت ایسا تھا

ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے  
چٹخ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا

یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک  
کوئی نہ سہہ سکے لہجہ کرخت ایسا تھا

کہاں کی سیر نہ کی تو سن تخیل پر  
ہمیں تو یہ بھی سلیمان کے تخت ایسا تھا

ادھر سے گزرا تھا ملک سخن کا شہزادہ  
کوئی نہ جان سکا سازو رخت ایسا تھا



آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے  
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں گھلے پانی کی  
آنکھ جھپکی بھی نہیں ہاتھ سے پتوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں  
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے

تیرگی چھوڑ گئے دل میں اُجالے کے خطوط  
یہ ستارے مرے گھر ٹوٹ کے بے کار گرے

کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی تھی  
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتار گرے

دیکھ کر اپنے دروبام لرز جاتا ہوں  
میرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے  
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کے اندھیرے کی چٹان  
ہم سنبھل کر جو بہت چلتے تھے ناچار گرے

کیا کہوں دیدہ تر؟ یہ تو مرا چہرہ ہے  
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے

ہاتھ آیا نہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا  
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے

وہ تجلی کی شعاعیں تھیں کہ جلتے ہوئے تیر  
آئے ٹوٹ گئے آئینہ بردار گرے

دیکھتے کیوں ہو شکلیب اتنی بلندی کی طرف  
نہ اٹھایا کرو سر کو کہ یہ دستار گرے

☆

شفق جو رُوئے سحر پر گُلال ملنے لگی  
یہ بستیوں کی فضا کیوں دُھواں اُگلنے لگی

اسی لیے تو ہوا رو پڑی درختوں میں  
ابھی میں کھل نہ سکا تھا کہ رُت بدلنے لگی

اُتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا  
زمین پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

کسی کا جسم اگر چُھو لیا خیال میں بھی  
تو پور پور مری، مثل شمع جلنے لگی

میں ناپتا چلا قدموں سے اپنے سائے کو  
کبھی جو دشتِ مسافت میں دھوپ ڈھلنے لگی

مری نگاہ میں خواہش کا شاہجہاں بھی نہ تھا  
یہ برف سی ترے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی



ہوا چلی سرِ صحرا ، تو یوں لگا ، جیسے  
ردائے شام مرے دوش سے پھسلنے لگی

کہیں پڑا نہ ہو پرتو بہارِ رفتہ کا  
یہ سبز بوند سی پلکوں پہ کیا مچلنے لگی

نہ جانے کیا کہا اس نے بہت ہی آہستہ  
فضا کی ٹھہری ہوئی سانس پھر سے چلنے لگی

جو دل کا زہر تھا کاغذ پہ سب بکھیر دیا  
پھر اپنے آپ طبیعت مری سنبھلنے لگی

جہاں شجر پہ لگا تھا تیر کا زخم شکلب  
وہیں پہ دیکھ لے ، کونپل نئی نکلنے لگی

☆

وہی جھکی ہوئی بیلین، وہی دریچہ تھا  
مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا

میں لوٹ آیا ہوں خاموشیوں کے صحرا سے  
وہاں بھی تیری صدا کا غبار پھیلا تھا

قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا  
میں آب جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

شبِ سفر تھی، قبا تیرگی کی پہنے ہوئے  
کہیں کہیں پہ کوئی روشنی کا دھبہ تھا

بنی نہیں جو کہیں پر کلی کی تربت تھی  
سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا

یہ آڑھی ترچھی لکیریں بنا گیا ہے کون  
میں کیا کہوں، مرے دل کا ورق تو سادا تھا



خزاں کے چاند نے پوچھا یہ جھک کے کھڑکی میں  
کبھی چراغ بھی جلتا ہے اس حویلی میں؟

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے  
گزر ہوا ہے مرا کس اُجاڑ بستی میں!

جھکی چٹان، پھسلتی گرفت، بھولتا جسم  
میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھائی میں

زمانے بھر سے نرالی ہے آپ کی منطق  
ندی کو پار کیا کس نے اُلٹی کشتی میں

جلائے کیوں، اگر اتنے ہی قیمتی تھے خطوط  
گریدتے ہو عبث راکھ اب اُنکٹھی میں

عجب نہیں جو اُگیں یاں درخت پانی کے  
کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی میں

میں خاکداں سے نکل کر بھی کیا ہوا آزاد  
ہر اک طرف سے مجھے آسماں نے گھیرا تھا

اُتر گیا ترے دل میں تو شعر کہلایا  
میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا

اُدھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی  
کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول  
وہ نیلی جھیل تھی یا آسماں کا ٹکڑا تھا

میں ساحلوں میں اُتر کر شکلیب کیا لیتا  
ازل سے نام مرا پانیوں پہ لکھا تھا



وہ دُوریوں کا رہِ آب پر نشان کھلا  
وہ رینگنے لگی کشتی، وہ بادبان کھلا

مرے ہی کان میں سرگوشیاں سکوت نے کیں  
مرے سوا بھی کسی سے یہ بے زبان کھلا

سمجھ رہا تھا ستارے جنہیں، وہ آنکھیں ہیں  
مری طرف نگراں ہیں کئی جہان کھلا

مرا خزانہ ہے محفوظ میرے سینے میں  
میں سو رہوں گا یونہی چھوڑ کر مکان کھلا

ہر آن میرا نیا رنگ ہے نیا چہرہ  
وہ بھید ہوں جو کسی سے نہ میری جان کھلا

جزا کہیں کہ سزا اس کو بال و پر والے  
زمیں سکرتی گئی، جتنا آسمان کھلا

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر  
شکلیب، بابِ قفس، کیا کہوں، کس آن کھلا

مری گرفت میں آ کر نکل گئی تپتی  
پروں کے رنگ مگر رہ گئے ہیں مُٹھی میں

چلو گے ساتھ مرے آگہی کی سرحد تک؟  
یہ رہ گزار اُترتی ہے گہرے پانی میں

میں اپنی بے خبری سے شکلیب واقف ہوں  
بتاؤ پیچ ہیں کتنے تمہاری پگڑی میں

اے دوست، پہلے قرب کا نشہ عجیب تھا  
 میں سُن سکا نہ اپنے بدن کی پُکار بھی  
 رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا  
 اوجھل ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی  
 کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو!  
 کیا مجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی؟  
 کچھ عقل بھی ہے باعثِ توقیر اے شکلیب  
 کچھ آگے ہیں بالوں میں چاندی کے تار بھی

☆  
 آیا ہے ہر چڑھائی کے بعد اک اُتار بھی  
 پستی سے ہمکنار ملے کوہسار بھی  
 آخر کو تھک کے بیٹھ گئی اک مقام پر  
 کچھ دور میرے ساتھ چلی رہ گزار بھی  
 دل کیوں دھڑکنے لگتا ہے اُبھرے جو کوئی چاپ  
 اب تو نہیں کسی کا مجھے انتظار بھی  
 جب بھی سکوتِ شام میں آیا ترا خیال  
 کچھ دیر کو ٹھہر سا گیا آبتار بھی  
 کچھ ہو گیا ہے دُھوپ سے خاکستری بدن  
 کچھ جم گیا ہے راہ کا مجھ پر غبار بھی  
 اس فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے  
 جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

مکان اور نہیں ہے بدل گیا ہے کمیں  
اُفق وہی ہے مگر چاند دوسرا ہے کوئی

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں  
حُدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

شکلیبِ دیپ سے لہرا رہے ہیں پلکوں پر  
دیارِ چشم میں کیا آج رت جگا ہے کوئی!

☆

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی  
گُماں گزرتا ہے یہ شخص دوسرا ہے کوئی

ہوا نے توڑ کے پتہ زمیں پہ پھینکا ہے  
کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

بٹا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی!  
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

درخت راہ بتائیں ہلا ہلا کر ہاتھ  
کہ قافلے سے مسافر مچھڑ گیا ہے کوئی

چُھڑا کے ہاتھ بہت دور بہہ گیا ہے چاند  
کسی کے ساتھ سمندر میں ڈوبتا ہے کوئی

یہ آسمان سے ٹوٹا ہوا ستارہ ہے  
کہ دشتِ شب میں بھٹکتی ہوئی صدا ہے کوئی

بس چلے تو اپنی عریانی کو اس سے ڈھانپ لوں  
 نیلی چادر سی تھی ہے جو کھلے میدان پر  
 وہ خموشی انگلیاں چٹھا رہی تھی اے شکلب  
 یا کہ بوندیں بج رہی تھیں رات روشن دان پر

☆

درد کے موسم کا کیا ہو گا اثر انجان پر  
 دوستو پانی کبھی رکتا نہیں ڈھلوان پر

آج تک اس کے تعاقب میں بگولے ہیں رواں  
 ابر کا ٹکڑا کبھی برسا تھا ریگستان پر

میں جو پر بت پر چڑھا، وہ اور اونچا ہو گیا  
 آسماں ٹھکتا نظر آیا مجھے میدان پر

کمرے خالی ہو گئے، سایوں سے آنگن بھر گیا  
 ڈوبتے سورج کی کرنیں جب پڑیں دالان پر

اب یہاں کوئی نہیں ہے، کس سے باتیں کیجیے  
 یہ مگر چپ چاپ سی تصویر آتشدان پر

آج بھی شاید کوئی پھولوں کا تحفہ بھیج دے  
 تتلیاں منڈلا رہی ہیں کانچ کے گلدان پر

جُوئے روانِ دشت! ابھی سُوکھنا نہیں  
 ساون ہے دُور اور وہی شدّت ہے پیاس میں  
 رہتا تھا سامنے ترا چہرہ گُھلا ہوا  
 پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں  
 کانٹوں کی باڑ پھاند گیا تھا مگر شکلیب  
 رستہ نہ مل سکا مجھے پھولوں کی باس میں



میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں  
 مَر جھا کے آگرا ہوں مگر سرد گھاس میں  
 سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح  
 دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں  
 صحرا کی بُدوباش ہے اچھی نہ کیوں لگے  
 سُوکھی ہوئی گلاب کی ٹہنی گلاس میں  
 چمکے نہیں نظر میں ابھی نقش دُور کے  
 مصروف ہوں ابھی عملِ انعکاس میں  
 دھوکے سے اس حسین کو اگر چُوم بھی لیا  
 پاؤ گے دل کا زہر لُبوں کی مٹھاس میں  
 تارہ کوئی روائے شبِ ابر میں نہ تھا  
 بیٹھا تھا میں اداس بیابانِ یاس میں

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے  
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

سایہ نہیں تھا نیند کا آنکھوں میں دُور تک  
بکھرے تھے روشنی کے نگلیں آسمان پر

حق بات آ کے رُک سی گئی تھی کبھی شکلیب  
چھالے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک زبان پر

☆

ہم جنس اگر ملے نہ کوئی آسمان پر  
بہتر ہے خاک ڈالیے ایسی اڑان پر

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر  
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

پوچھو سمندروں سے کبھی خاک کا پتہ  
دیکھو ہوا کا نقش کبھی بادبان پر

یارو میں اس نظر کی بلندی کو کیا کروں  
سایہ بھی اپنا دیکھتا ہوں آسمان پر

کتنے ہی زخم ہیں مرے اک زخم میں چُھپے  
کتنے ہی تیر آنے لگے اک نشان پر

جل تھل ہوئی تمام زمیں آس پاس کی  
پانی کی بوند بھی نہ گری سائبان پر





غمِ دل حیطہ تحریر میں آتا ہی نہیں  
جو کناروں میں سمٹ جائے وہ دریا ہی نہیں

اوس کی بوندوں میں بکھرا ہوا منظر جیسے  
سب کا اس دور میں یہ حال ہے میرا ہی نہیں

برق کیوں ان کو جلانے پہ کمر بستہ ہے  
میں تو چھاؤں میں کسی پیڑ کی بیٹھا ہی نہیں

اک کرن تھام کے میں ڈھوپ نگر تک پہنچا  
کون سا عرش ہے جس کا کوئی زینہ ہی نہیں

کوئی بھولا ہوا چہرہ نظر آئے شاید  
آئینہ غور سے تو نے کبھی دیکھا ہی نہیں

بوجھ لحوں کا ہر اک سر پہ اٹھائے گزرا  
کوئی اس شہر میں سستانے کو ٹھہرا ہی نہیں

سایہ کیوں جل کے ہوا خاک تھے کیا معلوم  
تو کبھی آگ کے دریاؤں میں اُترا ہی نہیں

موتی کیا کیا نہ پڑے ہیں تہ دریا لیکن  
برف لہروں کی کوئی توڑنے والا ہی نہیں

اس کے پردوں پہ منقش تری آواز بھی ہے  
خانہ دل میں فقط تیرا سراپا ہی نہیں

حائلِ راہ تھے کتنے ہی ہوا کے پر بت  
تو وہ بادل کہ مرے شہر سے گزرا ہی نہیں

یاد کے دائرے کیوں پھیلتے جاتے ہیں شکلیب  
اس نے تالاب میں کنکر ابھی پھینکا ہی نہیں

بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجئے  
 مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت  
 جمی رہے گی نگاہوں پہ تیرگی دن بھر  
 کہ رات خواب میں تارے اتر کے آئے بہت  
 شکلیب کیسی اڑان اب وہ پر ہی ٹوٹ گئے  
 کہ زیرِ دام جب آئے تھے پھڑ پھڑائے بہت

☆  
 وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت  
 میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت  
 کسی کے سر پہ کبھی ٹوٹ کر گرا ہی نہیں  
 اس آسمان نے ہوا میں قدم جمائے بہت  
 نہ جانے رُت کا تصرف تھا یا نظر کا فریب  
 کلی وہی تھی مگر رنگ جھلملائے بہت  
 ہوا کا رُخ ہی اچانک بدل گیا ورنہ  
 مہک کے قافلے صحرا کی سمت آئے بہت  
 یہ کائنات ہے میری ہی خاک کا ذرہ  
 میں اپنے دشت سے گزرا تو بھید پائے بہت  
 جو موتیوں کی طلب نے کبھی اُداس کیا  
 تو ہم بھی راہ سے کنکر سمیٹ لائے بہت



تیز آنڈھیوں میں اڑتے پر و بال کی طرح  
ہر شے گزشتی ہے مہ و سال کی طرح

کیوں کر کہوں کہ درپے آزار ہے وہی  
جو آسماں ہے سر پہ مرے ڈھال کی طرح

یوں بے سبب تو کوئی نہیں پوجتا نہیں  
کچھ تو ہے پتھروں میں خدوخال کی طرح

کیا کچھ کیا نہ خود کو چھپانے کے واسطے  
عُریانیوں کو اوڑھ لیا شال کی طرح

اب تک مرا زمین سے رشتہ ہے اُستوار  
رہنِ ستم ہوں سبزہ پامال کی طرح

میں خود ہی جلوہ ریز ہوں، خود ہی نگاہِ شوق  
شَقاف پانیوں پہ جھکی ڈال کی طرح

ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہ زن شکلب  
چلیے چھپا کے غم بھی زر و مال کی طرح



جہاں تک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے  
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو  
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

بُرّا نہ مانے لوگوں کی عیب جوئی کا  
انہیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے  
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو  
وہ دُور کوئی جزیرا دکھائی دیتا ہے

وہ الوداع کا منظر، وہ بھیکتی پلکیں  
پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے



پھر سن رہا ہوں گزرے زمانے کی چاپ کو  
بھولا ہوا تھا دیر سے میں اپنے آپ کو

رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں  
اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو

اشکوں کی ایک نہر تھی جو خشک ہو گئی  
کیوں کر مٹاؤں دل سے ترے غم کی چھاپ کو

کتنا ہی بے کنار سمندر ہو پھر بھی دوست  
رہتا ہے بے قرار ندی کے ملاپ کو

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں  
پھر آئے میں چوم لیا اپنے آپ کو

تعریف کیا ہو قامتِ دلدار کی شکلیب  
تجسیم کر دیا ہے کسی نے الاپ کو

مری نگاہ سے چھپ کر کہاں رہے گا کوئی  
کہ اب تو سنگ بھی شیشہ دکھائی دیتا ہے

سمٹ کے رہ گئے آخر پہاڑ سے قد بھی  
زمین سے ہر کوئی اُونچا دکھائی دیتا ہے

کھلی ہے دل میں کسی کے بدن کی دُھوپ شکلیب  
ہر ایک پُھول سنہرا دکھائی دیتا ہے



نخوشی بول اُٹھے ہر نظر پیغام ہو جائے  
یہ سناٹا اگر حد سے بڑھے کہرام ہو جائے

ستارے مشعلیں لے کر مجھے بھی ڈھونڈنے نکلیں  
میں رستہ بھول جاؤں، جنگلوں میں شام ہو جائے

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں  
خود اپنی چاپ سُن کر لرزہ براندام ہو جائے

مثال ایسی ہے اس دورِ خرد کے ہوش مندوں کی  
نہ ہو دامن میں ذرہ اور صحرا نام ہو جائے

شکلیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے  
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے



یادیں ہیں اپنے شہر کی، اہل سفر کے ساتھ  
صحرا میں لوگ آئے ہیں دیوار و در کے ساتھ

منظر کو دیکھ کر پس منظر بھی دیکھیے  
بستی نئی بسی ہے پُرانے کھنڈر کے ساتھ

سائے میں جان پڑگئی دیکھا جو غور سے  
مخصوص یہ کمال ہے اہل نظر کے ساتھ

اک دن ملا تھا بام پہ سورج کہیں جسے  
اُلجھے ہیں اب بھی دھوپ کے ڈورے لگر کے ساتھ

اک یاد ہے کہ دامن دل چھوڑتی نہیں  
اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

اس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو  
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کے ساتھ

مہری طرح یہ صبح بھی فنکار ہے شکلیب  
لکھتی ہے آسماں پہ غزل، آب زر کے ساتھ

یہ کیا کہ دل کے دیپ کی لو ہی تراش لی  
سورج اگر ہے کرنوں کی جھالر لگا مجھے

صدیوں میں طے ہوا تھا بیاباں کا راستہ  
گلشن کو لوٹتے ہوئے پل بھر لگا مجھے

میں نے اسے شریکِ سفر کر لیا شکلب  
اپنی طرح سے چاند جو بے گھر لگا مجھے

☆

اس بُت کدے میں تو جو حسین تر لگا مجھے  
اپنے ہی اک خیال کا پیکر لگا مجھے

جب تک رہی جگر میں لہو کی ذرا سی بوند  
مٹھی میں اپنی بند سمندر لگا مجھے

مُر جھا گیا جو دل میں اُجالے کا سُرخ پھول  
تاروں بھرا یہ کھیت بھی بنجر لگا مجھے

اب یہ بتا کہ روح کے شعلے کا کیا ہے رنگ  
مرمر کا یہ لباس تو سُندر لگا مجھے

کیا جانے کہ اتنی اُداسی تھی رات کیوں  
مہتاب اپنی قبر کا پتھر لگا مجھے

آنکھوں کو بند کر کے بڑی روشنی ملی  
مدہم تھا جو بھی نقش اُجاگر لگا مجھے



ساحل تمام اشکِ ندامت سے اٹ گیا  
دریا سے کوئی شخص تو پیاسا پلٹ گیا

لگتا تھا بے کراں مجھے صحرا میں آسماں  
پہنچا جو بستیوں میں تو خانوں میں بٹ گیا

یا اتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر  
یا اتنا نرم دل کہ رگِ گل سے کٹ گیا

بانہوں میں آسکا نہ حویلی کا اک ستون  
پتلی میں میری آنکھ کی صحرا سمٹ گیا

اب کون جائے کوئے ملامت کو چھوڑ کر  
قدموں سے آکے اپنا ہی سایہ لپٹ گیا

گنبد کا کیا قصور اُسے کیوں کہو بُرا  
آیا جدھر سے تیرا ادھر ہی پلٹ گیا



مُر جھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ  
سُورج ہوں، میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ

ہر چند راکھ ہو کے بکھرنا ہے راہ میں  
جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں، مجھے بھی دیکھ

عالم میں جس کی دھوم تھی، اس شاہکار پر  
دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

تو نے کہا نہ تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں  
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ، مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

بچھتی تھیں جس کی راہ میں پھولوں کی چادریں  
اب اس کی خاک گھاس کے پیرں تلے بھی دیکھ

کیا شاخِ باثمر ہے جو تکتا ہے فرش کو  
نظریں اٹھا شکلیب، کبھی سامنے بھی دیکھ



عشق پیشہ نہ رہے داد کے حقدار یہاں  
پیش آتے ہیں رُعونت سے جفا کار یہاں

سرپنگ کر درِ زنداں پہ صبا نے یہ کہا  
ہے دریچہ نہ کوئی روزنِ دیوار یہاں

عہد و پیمانِ وفا، پیار کے نازک بندھن  
توڑ دیتی ہے زروسیم کی جھنکار یہاں

نگ و ناموس کے بکتے ہوئے انمول رتن  
لب و رخسار کے سجتے ہوئے بازار یہاں

سرخ، دامنِ گل کس کو میسر آئی؟  
اپنے ہی خوں میں نہائے لب و رخسار یہاں

کشتیِ زیست سلامت ہے نہ پتوار یہاں  
موجِ درموج ہیں سو رنگ کے منجدھار یہاں

رکھتا ہے خود سے کون حریفانہ کشمکش  
میں تھا کہ رات اپنے مقابل ہی ڈٹ گیا

جس کی اماں میں ہوں، وہی اکتا گیا نہ ہو  
بوندیں یہ کیوں برستی ہیں، بادل تو چھٹ گیا

وہ لمحہ شعور جسے جاننی کہیں  
چہرے سے زندگی کے نقائیں اُلٹ گیا

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور  
رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

اک حشر سا پاپا تھا مرے دل میں اے شکلیب  
کھولیں جو کھڑکیاں تو ذرا شور گھٹ گیا





اتریں عجیب روشنیاں رات خواب میں  
کیا کیا نہ عکس تیر رہے تھے سراب میں

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی  
وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

پانی نہیں کہ اپنے ہی چہرے کو دیکھ لوں  
منظر زمیں کے ڈھونڈتا ہوں ماہتاب میں

پھر تیرگی کے خواب سے چونکا ہے راستہ  
پھر روشنی سی دوڑ گئی ہے سحاب میں

کب تک رہے گا رُوح پہ پیراہن بدن  
کب تک ہوا اسیر رہے گی حجاب میں

یوں آئندہ بدست ملی پربتوں کی برف  
شرما کے دھوپ لوٹ گئی آفتاب میں

ہمسفر چھوٹ گئے راہنما رُوٹھ گئے  
یوں بھی آسان ہوئی منزلِ دشوار یہاں

تیرگی ٹوٹ پڑی زور سے بادل گر جا  
بجھ گئی سہم کے قندیلِ رُخ یار یہاں

کتنے طوفان اُٹھے کتنے ستارے ٹوٹے  
پھر بھی ڈوبا نہیں اب تک دلِ بیدار یہاں

میرے زخمِ کفِ پا چومنے آئے گی بہار  
میں اگر مر بھی گیا ، وادی پُر خار یہاں



کیا کہیے کہ اب اس کی صدا تک نہیں آتی  
اوپچی ہوں فضیلیں تو ہوا تک نہیں آتی

شاید ہی کوئی آسکے اس موڑ سے آگے  
اس موڑ سے آگے تو قضا تک نہیں آتی

وہ گل نہ رہے نہتِ گل خاک ملے گی  
یہ سوچ کے گلشن میں صبا تک نہیں آتی

اس شورِ تلاطم میں کوئی کس کو پکارے  
کانوں میں یہاں اپنی صدا تک نہیں آتی

خوددار ہوں، کیوں آؤں درِ اہلِ کرم پر  
کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی

اس دشت میں قدموں کے نشاں ڈھونڈ رہے ہو  
پیڑوں سے جہاں چھن کے ضیاء تک نہیں آتی

جینے کے ساتھ موت کا ڈر ہے لگا ہوا  
خشکی دکھائی دی ہے سمندر کو خواب میں

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک  
اُبھرا ہوں ڈوب ڈوب کے تصویرِ آب میں

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام  
اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

چوما ہے میرا نام لپ سُرُخ نے شکلیب  
یا پھول رکھ دیا ہے کسی نے کتاب میں



جب تک غمِ جہاں کے حوالے ہوئے نہیں  
ہم زندگی کے جاننے والے ہوئے نہیں

کہتا ہے آفتابِ ذرا دیکھنا کہ ہم  
ڈوبے تھے گہری رات میں کالے ہوئے نہیں

چلتے ہو سینہ تان کے دھرتی پہ کس لیے  
تم آسماں تو سر پہ سنبھالے ہوئے نہیں

انمول وہ گمہر ہیں جہاں کی نگاہ میں  
دریا کی جو تہوں سے نکالے ہوئے نہیں

طے کی ہے ہم نے صورتِ مہتاب راہِ شب  
طولِ سفر سے پاؤں میں چھالے ہوئے نہیں

ڈس لیں تو ان کے زہر کا آسان ہے اتار  
یہ سانپ آستین کے پالے ہوئے نہیں

تیشے کا کام ریشہِ گل سے لیا شکلیب  
ہم سے پہاڑ کاٹنے والے ہوئے نہیں

یا جاتے ہوئے مجھ سے لپٹ جاتی تھیں شاخیں  
یا میرے بلانے سے صبا تک نہیں آتی

کیا خشک ہوا روشنیوں کا وہ سمندر  
اب کوئی کرن، آبلہ پا تک نہیں آتی

پُھپ پُھپ کے سدا جھانکتی ہیں خلوتِ گل میں  
مہتاب کی کرنوں کو حیا تک نہیں آتی

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا!  
ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

بہتر ہے پلٹ جاؤ سیہ خانہِ غم سے  
اس سرد گکھا میں تو ہوا تک نہیں آتی

مجھ سے شفاف ہے سینہ کس کا  
چاند اس جھیل میں اُترا ہوتا

اور بھی ٹوٹ کے آتی تری یاد  
میں جو کچھ دن تجھے بھولا ہوتا

راکھ کر دیتے جلا کر شعلے  
یہ دھواں دل میں نہ پھیلا ہوتا

کچھ تو آتا مری باتوں کا جواب  
یہ کنواں اور جو گہرا ہوتا

نہ بکھرتا جو فضا میں نغمہ  
سینہ نے میں تڑپتا ہوتا

اور کچھ دُور تو چلتے مرے ساتھ  
اور اک موڑ تو کاٹا ہوتا

تھی مقدر میں خزاں ہی تو شکلیب  
میں کسی دشت میں مہکا ہوتا

☆

چلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا  
کاش میں پیڑوں کا سایا ہوتا

تو جو اس راہ سے گزرا ہوتا  
تیرا ملبوس بھی کالا ہوتا

میں گھٹا ہوں، نہ پون ہوں، نہ چراغ  
ہمنشیں میرا کوئی کیا ہوتا

زخم عریاں تو نہ دیکھے گا کوئی  
میں نے کچھ بھیس ہی بدلا ہوتا

کیوں سفینے میں چھپاتا دریا  
گر تجھے پار اُترنا ہوتا

بن میں بھی ساتھ گئے ہیں سائے  
میں کسی جا تو اکیلا ہوتا



غمِ اُلفت مرے چہرے سے عیاں کیوں نہ ہوا  
آگ جب دل میں سلگتی تھی، دُھواں کیوں نہ ہوا

سیلِ غم رکتا نہیں ضبط کی دیواروں سے  
جوشِ گریہ تھا تو میں گریہ گناں کیوں نہ ہوا

کہتے ہیں، حُسنِ خدوخال کا پابند نہیں  
ہر حُسنِ شے پہ مجھے تیرا گماں کیوں نہ ہوا

دشت بھی اس کے ملیں، شہر بھی اس میں آباد  
تو جہاں آن بے دل وہ مکاں کیوں نہ ہوا



تو وہی ہے جو مرے دل میں چُھپا بیٹھا ہے  
اک یہی راز کبھی مجھ پہ عیاں کیوں نہ ہوا

یہ سمجھتے ہوئے مقصودِ نظر ہے تو ہی  
میں ترے حُسن کی جانب نگراں کیوں نہ ہوا



ملا نہیں اذنِ رقص جن کو، کبھی تو وہ بھی شرار دیکھو  
اگر ہو اہلِ نگاہ یارو، چٹان کے آر پار دیکھو

یہ جان لینا، وہاں بھی کوئی کسی کی آمد کا منتظر تھا  
کسی مکاں کے جو بام و در پر تجھے دیوں کی قطار دیکھو

اگرچہ بے خانماں ہیں، لیکن ہمارا ملنا نہیں ہے مشکل  
ادھر ہی صحرا میں دوڑ پڑنا، جدھر سے اٹھتا غبار دیکھو

عجب نہیں ہے، پہاڑیوں پر شفق کا سونا پگھل رہا ہو  
مکانِ تیرہ کے روزنوں میں یہ نور کے آبنار دیکھو

جو ابرِ رحمت سے ہونہ پایا، کیا ہے وہ کام آندھیوں نے  
نہیں ہے خارو گیہاہ باقی، چمک اٹھا رہ گزار دیکھو

وہ راگ خاموش ہو چکا ہے، سنانے والا بھی سوچکا ہے  
لرز رہے ہیں مگر ابھی تک شکستہ بربط کے تار دیکھو

اک آہ بھرنا شکلیب ہم سے خزاں نصیبوں کو یاد کر کے  
کلائیوں میں جو ٹہنیوں کی، مہکتی کلیوں کے بار دیکھو



منظر تھا اک اُجاڑ نگاہوں کے سامنے  
کیا کیا نہ رنگ بھر دیے افسوں شام نے

اس حادثے کی نخوتِ ساقی کو کیا خبر  
بادہ پیا کہ زہر پیا تشنہ کام نے

چہرے سے اجنبی تھا وہ میرے لیے مگر  
سب راز اس کے کہہ دیے طرزِ خرام نے

نکلا نہیں ہوں آج بھی اپنے حصار سے  
حدِ نگاہ آج بھی ہے میرے سامنے

تھے حادثوں کے وار تو کاری مگر مجھے  
مرنے نہیں دیا خلشِ انتقام نے

اک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکلیب  
دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے

اس سے پہلے کہ ترے لمس کی خوشبو کھو جائے

تجھ کو پالینے کا ارمان جواں کیوں نہ ہوا

ق

تپتے صحرا تو مری منزلِ مقصود نہ تھے

میں کہیں ہمسفرِ ابر رواں کیوں نہ ہوا

اجنبی پر تو یہاں لطفِ سوا ہوتا ہے

میں بھی اس شہر میں بے نام و نشان کیوں نہ ہوا

نارسائی تھی مرے شوق کا حاصل تو شکلیب

حائلِ راہ کوئی سنگِ گراں کیوں نہ ہوا



اب آپ رہِ دل جو گُشادہ نہیں رکھتے  
ہم بھی سفرِ جاں کا ارادہ نہیں رکھتے

پینا ہو تو اک جرعہ زہراب بہت ہے  
ہم تشنہ دہنِ تہمتِ بادہ نہیں رکھتے

اشکوں سے چراغاں ہے شبِ زیستِ سو وہ بھی  
کو تاہی مژگاں سے زیادہ نہیں رکھتے

یہ گردِ رہِ شوق ہی جم جائے بدن پر  
رُسا ہیں کہ ہم کوئی لبادہ نہیں رکھتے

ہر گام پہ جگنو سا چمکتا ہے جو دل میں  
ہم اس کے سوا مشعلِ جادہ نہیں رکھتے

سُرخِ نہیں پھولوں کی تو زخموں کی شفق ہے  
دامانِ طلبِ ہم کبھی سادہ نہیں رکھتے



جو بھی ہے طالبِ یک ذرہ اُسے صحرا دے  
مجھ پہ مائل بہ کرم ہے تو دلِ دریا دے

کب سے ہوں حسرتیٰ یک نگہِ گرم کہ جو  
مخفلِ شوق کے آداب مجھے سمجھا دے

خلشِ غم سے مری جاں پہ بنی ہے جیسے  
ریشمیں شال کو کانٹوں پہ کوئی پھیلا دے

زحمتِ جاں کوئی لٹانے ادھر آ بھی نہ سکے  
ایسے مشکل تو نہیں دشتِ وفا کے جادے

بتی یاوں کا تقاضا تو بجا ہے لیکن  
گردشِ شام و سحر کیسے کوئی ٹھہرا دے

مجھ کو زنداں میں بھی مل جائے گا عنوانِ جُوں  
نگاہتِ گل کو کریں قیدِ خیاباں زادے

کتنی رعنائیاں آباد ہیں مرے دل میں  
 اک خرابہ نظر آتا ہے مگر باہر سے  
 وادیِ خواب میں اس گل کا گزر کیوں نہ ہوا  
 رات بھر آتی رہی جس کی مہک بستر سے  
 طعنِ اغیار سُنیں آپ خموشی سے شکلیب  
 خود پلٹ جاتی ہیں ٹکرا کے صدا پتھر سے

☆  
 موجِ غم اس لیے شاید نہیں گزری سر سے  
 میں جو ڈوبا تو نہ ابھروں گا کبھی ساغر سے  
 اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا  
 آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے  
 کتنی گم سُم مرے آنگن سے صبا گزری ہے  
 اک شرر بھی نہ اڑا روح کی خاکستر سے  
 پیار کی جوت سے گھر گھر ہے چراغاں ورنہ  
 اک بھی شمع نہ روشن ہو ہوا کے ڈر سے  
 اڑتے بادل کے تعاقب میں پھرو گے کب تک  
 درد کی دھوپ میں نکلا نہیں کرتے گھر سے





تو نے کیا کیا نہ اے زندگی، دشت و در میں پھرایا مجھے  
اب تو اپنے در و بام بھی جانتے ہیں پرایا مجھے

اور بھی کچھ بھڑکنے لگا میرے سینے کا آتش کدہ  
راس تجھ بن نہ آیا کبھی سبز پیڑوں کا سایا مجھے

ان نئی کونپلوں سے مرا کیا کوئی بھی تعلق نہ تھا  
شاخ سے توڑ کر اے صبا، خاک میں کیوں ملایا مجھے

درد کا دیپ جلتا رہا دل کا سونا پگھلتا رہا  
ایک ڈوبے ہوئے چاند نے رات بھر خوں رلایا مجھے

اب مرے راستے میں کہیں خوفِ صحرا بھی حائل نہیں  
خشک پتے نے آوارگی کا قرینہ سکھایا مجھے

مدّتوں رُوئے گل کی جھلک کو ترستا رہا میں شکلیب  
اب جو آئی بہار اس نے صحنِ چمن میں نہ پایا مجھے



اُتر گیا تِنِ نازک سے پتوں کا لباس  
کسی کے ہاتھ نہ آئی مگر گلاب کی باس

اب اپنے جسم کے سائے میں تھک کے بیٹھ رہو  
کہیں درخت نہیں راستے میں، دُور نہ پاس

ہزار رنگ کی ظلمت میں لے گئی مجھ کو  
بس ایک چراغ کی خواہش؛ بس اک شرار کی آس

تمہارے کام نہ آئے گا جو بھی دانا ہے  
ہر ایک شخص پہ کیوں کر رہے ہو اپنا قیاس

کسی کی آس تو ٹوٹی، کوئی تو ہار گیا  
کہ نیم باز درپچوں میں روشنی ہے اُداس

وہ کالے کوس کی دوری اب ایک خواب سی ہے  
تم آگئے ہو مگر کب نہ تھے ہمارے پاس

یہ کیا طلسم ہے، جب سے کنارِ دریا ہوں  
شکلیب اور بھی کچھ بڑھ گئی ہے رُوح کی پیاس



اس خاکداں میں اب تک باقی ہیں کچھ شر سے  
دامن بچا کے گزرو یادوں کی رہ گزر سے

ہر ہر قدم پہ آنکھیں تھیں فرشِ راہ لیکن  
وہ روشنی کا ہالا اُترا نہ بام پر سے

کیوں جادۂ وفا پر مشعل بکف کھڑے ہو  
اس سیلِ تیرگی میں نکلے گا کون گھر سے

کس دشت کی صدا ہو اتنا مجھے بتا دو  
ہر سو بچھے ہیں رستے آؤں تو میں کدھر سے

اُجڑا ہوا مکان ہے یہ دل جہاں پہ ہر شب  
پر چھائیاں لپٹ کر روتی ہیں بام و در سے



اب میسر نہیں فرصت کے وہ دن رات ہمیں  
لے اڑی جانے کہاں صرصرِ حالات ہمیں

آج وہ یوں نلگہ شوق سے بچ کر گزرے  
جیسے یاد آئے کوئی بھولی ہوئی بات ہمیں

کیسے اڑتے ہوئے لمحوں کا تعاقب کیجئے  
دوستو! اب تو یہی فکر ہے دن رات ہمیں

نہ سہی، کوئی ہجوم گل و لالہ نہ سہی  
دشت سے کم بھی نہیں رنجِ خیالات ہمیں

وہ اگر غیر نہ سمجھے تو کوئی بات کریں  
دلِ ناداں سے بہت سی ہیں شکایات ہمیں

دھوپ کی لہر ہے تو سایہ دیوار ہیں ہم  
آج بھی ایک تعلق ہے ترے سات ہمیں

رنگ و مستی کے جزیروں میں لیے پھرتے ہیں  
اس کی پائل سے پڑائے ہوئے نعمات ہمیں

یہ گُہر جس کو آفتاب کہیں  
کس اندھیرے کی کان سے نکلا

شکر ہے اس نے بے وفائی کی  
میں کڑے امتحان سے نکلا

لوگ دشمن ہوئے اسی کے شکلیب  
کام جس مہربان سے نکلا

☆

آگ کے درمیان سے نکلا  
میں بھی کس امتحان سے نکلا

پھر ہوا سے سُلگ اٹھے پتے  
پھر دُھواں گلستان سے نکلا

جب بھی نکلا ستارہ اُمید  
کھر کے درمیان سے نکلا

چاندنی جھانکتی ہے گلیوں میں  
کوئی سایہ مکان سے نکلا

ایک شعلہ پھر ایک دھویں کی لکیر  
اور کیا خاکدان سے نکلا

چاند جس آسمان میں ڈوبا  
کب اسی آسمان سے نکلا



تارے ہیں نہ ماہتاب یارو  
کچھ اس کا بھی سدباب یارو

آنکھوں میں چٹائیں جل رہی ہیں  
ہونٹوں پہ ہے آب آب یارو

تاحد خیال ریگ صحرا  
تاحد نظر سراب یارو

رہبر ہی نہیں ہے ساتھ اپنے  
رہزن بھی ہیں ہم رکاب یارو

ٹھلے سے جہاں لپک رہے ہیں  
بر سے گا وہیں سحاب یارو



وہ سامنے تھا پھر بھی کہاں سامنا ہوا  
رہتا ہے اپنے نور میں سورج چھپا ہوا

اے روشنی کی لہر کبھی تو پلٹ کے آ  
تجھ کو بلا رہا ہے دریچہ گھلا ہوا

سیراب کس طرح ہو زمیں دور دور کی  
ساحل نے ہے ندی کو مقید کیا ہوا

اے دوست، چشم شوق نے دیکھا ہے بارہا  
بجلی سے تیرا نام گھٹا پر لکھا ہوا

پہچانتے نہیں اسے محفل میں دوست بھی  
چہرہ ہو جس کا گردِ آلم سے اٹا ہوا

اس دور میں خلوص کا کیا کام اے شکلب  
کیوں کر چلے بساط پہ مہرہ پٹا ہوا



اب یہ ویران دن کیسے ہوگا بسر  
رات تو کٹ گئی درد کی سیج پر

بس یہیں ختم ہے پیار کی رہ گزر  
دوست، اگلا قدم کچھ سمجھ سوچ کر

اس کی آوازِ پا تو بڑی بات ہے  
ایک پتہ بھی کھڑکا نہیں رات بھر

گھر میں طوفان آئے زمانہ ہوا  
اب بھی کانوں میں بجتی ہے زنجیرِ در

اپنا دامن بھی اب تو میسر نہیں  
کتنے ارزاں ہوئے آنسوؤں کے گہر

یہ شکستہ قدم بھی ترے ساتھ تھے  
اے زمانے ٹھہر! اے زمانے ٹھہر!

اپنے غم پر تبسم کا پردہ نہ ڈال  
دوست، ہم ہیں سوار ایک ہی ناؤ پر



سمجھ سکو تو یہ تشنہ لہی سمندر ہے  
بقدرِ ظرف ہر اک آدمی سمندر ہے

اُبھر کے ڈوب گئی کشتی خیال کہیں  
یہ چاند ایک بھنور، چاندنی سمندر ہے

جو داستاں نہ بنے درد، بیکراں ہے وہی  
جو آنکھ ہی میں رہے وہ نمی سمندر ہے

نہ سوچے تو بہت مختصر ہے سیرِ حیات  
جو سوچے تو یہی زندگی سمندر ہے

تو اس میں ڈوب کے شاید اُبھر سکے نہ کبھی  
مرے حبیب! مری خامشی سمندر ہے



کون جانے کہاں ہے شہر سکوں  
قریہ قریہ بھٹک رہا ہے جُوں

نورِ منزل مجھے نصیب کہاں  
میں ابھی حلقہٴ غبار میں ہوں

یہ ہے تاکید سننے والوں کی  
واقعہ خوشگوار ہو تو کہوں

کن اندھیروں میں کھو گئی ہے سحر  
چاند تاروں پہ مار کر شب نُوں

تم جسے نورِ صبح کہتے ہو  
میں اسے گردِ شام بھی نہ کہوں

اب تو خونِ جگر بھی ختم ہوا  
میں کہاں تک خلاء میں رنگ بھروں

جی میں آتا ہے اے رہِ ظلمت  
کہکشاں کو مروڑ کر رکھ دوں



دستلیں دیتی ہیں شب کو درِ دل پر یادیں  
کچھ نہیں ہے مگر اس گھر کا مقدر یادیں

ڈھونڈتی ہیں تری مہکی ہوئی زلفوں کی بہار  
چاندنی رات کے زینے سے اتر کر یادیں

عشرتِ رفتہ کو آواز دیا کرتی ہیں  
ہر نئے لمحے کی دہلیز پہ جا کر یادیں

رنگ بھرتے ہیں خلاؤں میں ہیولے کیا کیا  
پیش کرتی ہیں عجب خواب کا منظر یادیں

نہ کسی زلف کا عبز نہ گلوں کی خوشبو  
کر گئی ہیں مری سانسوں کو معطر یادیں

کم نہیں رات کے صحرا سے مرے دل کی فضا  
اور آکاش کے تاروں سے فزوں تر یادیں

مشعلِ غم نہ بچھاؤ کہ شکلیب اس کے بغیر  
راستہ گھر کا بھلا دیتی ہیں اکثر یادیں



کہاں رُکیں گے مُسافر نئے زمانوں کے  
بدل رہا ہے جُوں زاویے اُڑانوں کے

یہ دل کا زخم ہے اک روز بھر ہی جائے گا  
شگاف پُر نہیں ہوتے فقط چٹانوں کے

چھلک چھلک کے بڑھا میری سمت نیند کا جام  
پکھل پکھل کے گرے قفل قید خانوں کے

ہوا کے دشت میں تہائی کا گزر ہی نہیں  
مرے رفیق ہیں مُطرب گئے زمانوں کے

کبھی ہمارے نقوشِ قدم کو ترسیں گے  
وہی جو آج ستارے ہیں آسمانوں کے



موجِ صبا رواں ہوئی، رقصِ جُوں بھی چاہیے  
خیمہ گل کے پاس ہی دجلہ خوں بھی چاہیے

کشمکشِ حیات ہے سادہ دلوں کی بات ہے  
خواہشِ مرگ بھی نہیں، زہرِ سکوں بھی چاہیے

ضربِ خیال سے کہاں ٹوٹ سکیں گی بیڑیاں  
فکرِ چمن کے ہم رکاب جوشِ جنوں بھی چاہیے

نغمہ شوقِ خوب تھا، ایک کمی ہے مُطربہ!  
شعلہ لب کی خیر ہو، سوزِ دُروں بھی چاہیے

اتنا کرم تو کیجئے، بُجھتا کنول نہ دیجئے  
زخمِ جگر کے ساتھ ہی دردِ فزوں بھی چاہیے

دیکھیے ہم کو غور سے، پوچھیے اہلِ پور سے  
روحِ جمیل کے لیے، حالِ زُبوں بھی چاہیے



آئینہ جذباتِ نہاں ہیں تری آنکھیں  
اک کارگہ شیشہ گراں ہیں تری آنکھیں

سرچشمہ افکارِ جواں ہیں تری آنکھیں  
تابندہ خیالات کی جاں ہیں تری آنکھیں

اندازِ خموشی میں ہے گفتار کا پہلو  
گویا نہ سہی چُپ بھی کہاں ہیں تری آنکھیں

جاؤں گا کہاں توڑ کے زنجیرِ وفا کو  
ہر سو مری جانب بگڑاں ہیں تری آنکھیں

کہنا ہے وہی جس کی توقع ہے تجھے بھی  
مت پوچھ مرے دل کی زباں ہیں تری آنکھیں

پلکوں کے جھروکوں سے سُبُو جھانک رہے ہیں  
اُمید گہ تشنہ لباں ہیں تری آنکھیں

یوں ہی تو نہیں اُمدی چلی آتی ہیں غزلیں  
پہلو میں مرے زمزمہ خواں ہیں تری آنکھیں



پردہ شب کی اوٹ میں زہرہ جمال کھو گئے  
دل کا کنول بجھا تو شہر تیرہ و تار ہو گئے

ایک ہمیں ہی اے سحر نیند نہ آئی رات بھر  
زانوئے شب پہ رکھ کر سر سارے چراغ سو گئے

راہ میں تھے بُول بھی، رودِ شرر بھی، دُھول بھی  
جانا ہمیں ضرور تھا، گل کے طواف کو گئے

دیدہ ورو بتائیں کیا، تم کو یقین نہ آئے گا  
چہرے تھے جن کے چاند سے سینے میں داغ ہو گئے

داغِ شکست دوستو دیکھو کسے نصیب ہو  
بیٹھے ہوئے ہیں تیز رُو سست خرام تو گئے

اہل جنوں کے دل شکلیب نرم تھے موم کی طرح  
تیشہ یاس جب چلا تودہ سنگ ہو گئے



اُمید کی کرن ہو کہیں حسرتوں کے داغ  
 ہر دم نگار خانہ دل کو اُجالیے  
 شاید کہ ان کی سمت بڑھے کوئی دشتِ شوق  
 روندے ہوئے گلاب فضا میں اُچھالیے  
 ہاں، کوہِ شب کو کاٹ کے لانا ہے جوئے نور  
 ہاں، بڑھ کے آفتاب کا تیشہ سنبھالیے  
 وجدان کی ترنگ کا مصرف بھی ہو شکلیب  
 شاعر کی عظمتوں کو ہنسی میں نہ ٹالیے

☆  
 رعنائی نگاہ کو قالب میں ڈھالیے  
 پتھر کے پیرہن سے سراپا نکالیے  
 گزرا ہے دل سے جو رم آہو سا اک خیال  
 لازم ہے اس کے پاؤں میں زنجیر ڈالیے  
 دل میں پرانے درد کی اک ٹیس بھی نہیں  
 تخلیق کی لگن ہے تو زخموں کو پالیے  
 یہ گہر کا ہجوم درِ دل پہ تابہ کئے  
 بامِ یقیں سے ایک نظر اس پہ ڈالیے  
 احساس میں رچائیے قوسِ قزح کے رنگ  
 ادراک کی کمند ستاروں پہ ڈالیے  
 ہاں، کوزہ ہائے گل پہ ہے تنقید کیا ضرور  
 گرہو سکے تو خاک سے خورشید ڈھالیے



شاخو! بھری بہار میں رقصِ برہنگی!  
مہکی ہوئی وہ چادرِ گل بار کیا ہوئی!

بے نغمہ و صدا ہے وہ بُت خانہ خیال  
کرتے تھے گفتگو جہاں پتھر کے ہونٹ بھی

وہ پھر رہے ہیں زخم بہ پا آج دشت دشت  
قدموں میں جن کے شاخِ گل تر جھکی رہی

یوں بھی بڑھی ہے وسعتِ ایوانِ رنگ و بو  
دیوارِ گلستاں درِ زنداں سے جا ملی

رعنائیاں چمن کی تو پہلے بھی کم نہ تھیں  
اب کے مگر سجائی گئی شاخِ دار بھی



ہوائے شب سے نہ بچتے ہیں اور نہ جلتے ہیں  
کسی کی یاد کے جگنو دھواں اُگتے ہیں

شبِ بہار میں مہتاب کے حسین سائے  
اُداس پا کے ہمیں اور بھی مچلتے ہیں

اسیرِ دامِ بچوں ہیں ہمیں رہائی کہاں  
یہ رنگ و بو کے قفس اپنے ساتھ چلتے ہیں

یہ دل وہ کارگہ مرگ و زیست ہے کہ جہاں  
ستارے ڈوبتے ہیں آفتاب ڈھلتے ہیں

خود اپنی آگ سے شاید گداز ہو جائیں  
پرائی آگ سے کب سنگ دل پگھلتے ہیں



حَسَنِ فردا، غمِ امروز سے ضوِ پائے گا  
چاند ڈوبا ہے تو سورج بھی اُبھر آئے گا

آندھیوں میں بھی فروزاں ہے چراغِ اُمید  
خاک ڈالے سے یہ شعلہ کہیں بجھ جائے گا

کُو بہ کُو دام بچھے ہوں کہ کڑکتی ہو کماں  
طاہرِ دل پر پرواز تو پھیلانے گا

توڑ کر حلقہٴ شب، ڈال کے تاروں پہ کند  
آدمی عرصہٴ آفاق پہ چھا جائے گا

ہم بھی دو چار قدم چل کے اگر بیٹھ گئے  
کون پھر وقت کی رفتار کو ٹھہرائے گا

راہ میں جس کی دیا خونِ دل و جاں ہم نے  
وہ حسیں دَور بھی آئے گا، ضرور آئے گا



مجھ سے ملنے شبِ غم اور تو کون آئے گا  
میرا سایہ ہے جو دیوار پہ جم جائے گا

ٹھہرو ٹھہرو، مرے اصنامِ خیالی، ٹھہرو  
میرا دل گوشہٴ تنہائی میں گھبرائے گا

لوگ دیتے رہے کیا کیا نہ دلا سے مجھ کو  
زخمِ گہرا ہی سہی، زخمِ ہے بھر جائے گا

عزمِ پختہ ہی سہی ترکِ وفا کا، لیکن  
منتظر ہوں، کوئی آکر مجھے سمجھائے گا

آنکھ جھپکے نہ کہیں، راہ اندھیری ہی سہی  
آگے چل کر وہ کسی موڑ پہ مل جائے گا

دل سا انمول رتن کون خریدے گا شکلیب  
جب پکے گا تو یہ بے دام ہی پک جائے گا

☆  
ساحل سے دُور جب بھی کوئی خواب دیکھتے  
جلتے ہوئے چراغ تہِ آب دیکھتے

ہم نے فضول چھیڑ دی زخمِ نہاں کی بات  
چُپ چاپ رنگِ خندہ احباب دیکھتے

غم کی بس ایک موج نے جن کو ڈبو دیا  
اے کاش وہ بھی حلقہ گرداب دیکھتے

بیٹے دنوں کے زخمِ گریدے ہیں رات بھر  
آئی نہ جن کو نیند وہ کیا خواب دیکھتے

کشکولِ شعرِ تریلیے پھرتے نہ ہم شکلیب  
اس ریشمیں بدن پہ جو کُ خواب دیکھتے

☆  
مانندِ صبا جدھر گئے ہم  
کلیوں کو نہال کر گئے ہم

زنجیرِ پاپا اگر گئے ہم  
نغموں کی طرح بکھر گئے ہم

سُورج کی کرن تھے جانے کیا تھے  
ظلمت میں اُتر اُتر گئے ہم

جب بھی کوئی سنگِ راہ دیکھا  
طوفان کی طرح بپھر گئے ہم

چلنا تھا جہاں محال یارو!  
اس راہ سے بھی گزر گئے ہم

بن جائیں گی منزلیں وہیں پر  
بھولے سے جہاں ٹھہر گئے ہم

ہنس ہنس کے گلے ملے قضا سے  
تکمیلِ حیات کر گئے ہم

قصِ آشفته سراں دیکھیں گے  
 دُور ان انجمن آراؤں سے دُور  
 جستجو ہے دُرِیکتا کی شکلیب  
 سپیال چُنتے ہیں دریاؤں سے دُور

☆  
 بیٹھے چشموں سے، تنگ چھاؤں سے دُور  
 زخم کھلتے ہیں ترے گاؤں سے دُور  
 سنگِ منزل نے لہو اُگلا ہے  
 دُور ہم بادیہ پیماؤں سے دُور  
 کتنی شمعیں ہیں اسیرِ فانوس  
 کتنے یوسف ہیں زلیخاؤں سے دُور  
 کشتِ امید سلگتی ہی رہی  
 ابر برسا بھی تو صحراؤں سے دُور  
 جوِ حالات بھلا ہو تیرا  
 چین ملتا ہے شناساؤں سے دُور  
 ق  
 جتِ فکر بُلاتی ہے چلو  
 دیر و کعبہ سے کلیساؤں سے دُور



ہر ایک بات ہے منت کش زباں لوگو  
نہیں ہے کوئی بھی اپنا مزاج داں لوگو

کچھ اس طرح وہ حقائق کو سن کے چونک اٹھے  
بکھر گئیں سر محفل پہیلیاں لوگو

مرے لبوں سے کوئی بات بھی نہیں نکلی  
مگر تراش لیں تم نے کہانیاں لوگو

بہارِ نو بھی انہیں پھر سجا نہیں سکتی  
بکھر گئی ہیں جو پھولوں کی پتیاں لوگو

بڑا زمانہ ہوا آشیاں کو راکھ ہوئے  
مگر نگاہ ہے اب تک دُھواں دُھواں لوگو

خطا معاف، کہ مے سے شکلیب منکر ہے  
اُسے عزیز ہیں دنیا کی تلخیاں لوگو



کچھ دن اگر یہی رہا دیوار و در کا رنگ  
دیوار و در پہ دیکھنا خونِ جگر کا رنگ

بھولا نہیں ہوں مقتلِ اُمید کا سماں  
تحلیل ہو رہا تھا شفق میں سحرِ کارنگ

دنیا غریبِ شُعبہءِ جامِ جم ہوئی  
دیکھے گا کون خونِ دلِ کوزہ گر کا رنگ

اُلجھے ہوئے دھویں کی فضا میں ہے اک لکیر  
کیا پوچھتے ہو شمعِ سرِ رہ گزر کا رنگ

دامانِ فصلِ گل پہ خزاں کی لگی ہے چھاپ  
ذوقِ نظر پہ بار ہے برگ و ثمر کا رنگ

جمنے لگی شکلیب جو پلکوں پہ گردِ شب  
آنکھوں میں پھیلنے لگا خوابِ سحر کا رنگ



باقی ہے یہی ایک نشاں موسمِ گل کا  
جاری رہے گلشن میں بیاں موسمِ گل کا

جب پھول مرے چاکِ گریباں پہ ہنسے تھے  
لحہ وہی گزرا ہے گراں موسمِ گل کا

نادان گھٹاؤں کے طلبِ گار ہوئے ہیں  
شعلوں کو بنا کر نگراں موسمِ گل کا

سوکھے ہوئے پتوں کے جہاں ڈھیر ملے ہیں  
دیکھا تھا وہیں سیلِ رواں موسمِ گل کا



ہم آج ہیں پھر ملول یارو  
مرجھا گئے کھل کے پھول یارو

گزرے ہیں خزاں نصیب ادھر سے  
پیڑوں پہ جمی ہے دُھول یارو

تاجِ خیالِ لالہ و گل  
تاجِ نظرِ بول یارو

جب تک کہ ہوس رہی گلوں کی  
کانٹے بھی رہے قبول یارو

ہاں کوئی خطا نہیں تمہاری  
ہاں ہم سے ہوئی ہے بھول یارو



کوئی دیکھے تو سہی یارِ طرحدار کا شہر  
میری آنکھوں میں سجا ہے لب و رخسار کا شہر

دشتِ احساس میں شعلہ سا کوئی لپکا تھا  
اسی بنیاد پہ تعمیر ہوا پیار کا شہر

اُس کی ہر بات میں ہوتا ہے کسی بھید کا رنگ  
وہ طلسمات کا پیکر ہے کہ اسرار کا شہر

میری نظروں میں چراغاں کا سماں رہتا ہے  
میں کہیں جاؤں مرے ساتھ ہے دلدار کا شہر

یوں تری گرم نگاہی سے پگھلتے دیکھا  
جس طرح کانچ کا گھر ہو مرے پندار کا شہر

دل کا آفاق سمٹتا ہی چلا جاتا ہے  
اور پھیلے گا کہاں تک در و دیوار کا شہر

مسکراتے رہیں سینے کے دہکتے ہوئے داغ  
دائم آباد رہے درد کی سرکار کا شہر



دیکھتی رہ گئی محرابِ حرم  
ہائے انسان کی انگریزی کا خم

جب بھی ادہام مقابل آئے  
مثلِ شمشیر چلی نوکِ قلم

پر پرواز پہ یہ راز کھلا  
پستیوں سے تھا بلندی کا بھرم

غم کی دیوار گری تھی جن پر  
ہم وہی لوگ ہیں اے قصرِ ارم

چاندنی غازہ پائے جولاں  
کہکشاں جادہ ابنِ آدم

ایک تارہ بھی نہ پامال ہوا  
ایسے گزرے رہِ افلاک سے ہم





دنیا والوں نے چاہت کا مجھ کو صلہ انمول دیا  
پیروں میں زنجیریں ڈالیں ہاتھوں میں کشتکول دیا

اتنا گہرا رنگ کہاں تھا رات کے میلے آنچل کا  
یہ کس نے رو رو کئے گنگن میں اپنا کا جل گھول دیا

یہ کیا کم ہے اس نے بخشا ایک مہکتا درد مجھے  
وہ بھی ہیں جن کو رنگوں کا اک چمکیلا خول دیا

مجھ سا بے مایہ اپنوں کی اور تو خاطر کیا کرتا  
جب بھی ستم کا پیکار آیا میں نے سینہ کھول دیا

بیٹے لمحے دھیان میں آ کر مجھ سے سوالی ہوتے ہیں  
تو نے کس بنجر مٹی میں من کا امرت ڈول دیا

اشکوں کی اُجلی کلیاں ہوں یا سپنوں کے گُندن پھول  
اُلفت کی میزان میں میں نے جو تھا سب کچھ تول دیا



برگِ دل کی طرح ہے زرد ہوا  
پھانکتی ہے کہاں کی گرد ہوا

دل میں یادوں کا زہر گھول دیا  
کتنی قاتل ہے بن کی سرد ہوا

روز لاتی ہے اُن کہے پیغام  
شہرِ خُوباں سے کوچہ گرد ہوا



دم نہ مارے مری طرح جو ہے  
اس زمانے کے گرم و سرد ہوا

میں ہوں شعلہ بجائے چراغ بدست  
ڈھونڈ کر لائے مجھ سا فرد ہوا

سانس گھٹتی ہے شہرِ تن میں شکلیب  
کس خلا کی ہے رہ نورد ہوا



یہ جلوہ گاہِ ناز تماشائیوں سے ہے  
روشن جہاں کی انجمن آرائیوں سے ہے

روتے ہیں دل کے زخم تو ہنستا نہیں کوئی  
اتنا تو فائدہ مجھے تنہائیوں سے ہے

دیوانہ حیات کو اک شغل چاہیے  
نادانیوں سے کام نہ دانائیوں سے ہے

قیدِ بیاں میں آئے جو ناگفتنی نہ ہو  
وہ رابطہ کہ قلب کی گہرائیوں سے ہے

نادم نہیں ہوں داغِ فرومانگی پہ میں  
تیرا بھرم بھی میری جبین سانیوں سے ہے



روشن ہیں دل کے داغ، نہ آنکھوں کے شب چراغ  
کیوں شام ہی سے بچھ گئے محفل کے سب چراغ

وہ دن نہیں، کرن سے کرن میں لگے جو آگ  
وہ شب کہاں، چراغ سے جلتے تھے جب چراغ

تیرہ ہے خاکداں، تو فلک بے نجوم ہے  
لائے کہاں سے مانگ کے دستِ طلبِ چراغ

روشن ضمیر آج بھی ظلمت نصیب ہیں  
تم نے دیے ہیں پوچھ کے نام و نسبِ چراغ

وہ تیرگی ہے دشتِ وفا میں کہ الاماں!  
چمکے جو موجِ ریگ تو پائے لقبِ چراغ

دن ہو اگر تو رات سے تعبیر کیوں کریں  
سورج کو اہل ہوش دکھاتے ہیں کب چراغ

اے بادِ تند! وضع کے پابند ہم بھی ہیں  
پتھر کی اوٹ لے کے جلائیں گے اب چراغ



دشت و صحرا اگر بسائے ہیں  
ہم گلستاں میں کب سمائے ہیں

آپ نغموں کے منتظر ہوں گے  
ہم تو فریاد لے کے آئے ہیں

ایک اپنا دیا جلانے کو  
تم نے لاکھوں دیئے جھائے ہیں

کیا نظر آئے گا، ابھی ہم کو  
یک بیک روشنی میں آئے ہیں

یوں تو سارا چمن ہمارا ہے  
پُھول جتنے بھی ہیں پرائے ہیں



دل میں لرزاں ہے ترا شعلہ رخسار اب تک  
میری منزل میں نہیں رات کے آثار اب تک

پُھول مُرجھا گئے، گُلدان بھی گر کر ٹوٹا  
کیسی خوشبو میں بسے ہیں در و دیوار اب تک

حسرتِ دار نہاں ہے مرے دل میں شاید  
یاد آتی ہے مجھے قامتِ دلدار اب تک

وہ اُجالے کا کوئی سیلِ رواں تھا، کیا تھا  
میری آنکھوں میں ہے اک ساعتِ دیدار اب تک

تیشہٴ غم سے ہوئی روح تو ٹکڑے ٹکڑے  
کیوں سلامت ہے مرے جسم کی دیوار اب تک



چوٹ ہر گام پہ کھا کر جانا  
قرب منزل کے لیے مر جانا

ہم بھی کیا سادہ نظر رکھتے تھے  
سنگ ریزوں کو جواہر جانا

مشعلِ درد جو روشن دیکھی  
خانہٴ دل کو منور جانا

رشتہٴ غم کو رگ جاں سمجھے  
زخمِ خنداں کو گل تر جانا

یہ بھی ہے کارِ نسیمِ سحری  
پتی پتی کو جدا کر جانا

اپنے حق میں وہی تلوار بنا  
جسے اک پھول سا پیکر جانا



جس قدر خود کو وہ چھپاتے ہیں  
لوگ گرویدہ ہوتے جاتے ہیں

جو بھی ہمدرد بن کے آتے ہیں  
غم کا احساس ہی جگاتے ہیں

عہدِ ماضی کے زرفشاں لمحے  
شدتِ غم میں مسکراتے ہیں

خود کو بدنام کر رہا ہوں میں  
ان پہ الزام آئے جاتے ہیں

اجنبی بن کے جی رہا ہوں میں  
لوگ مانوس ہوتے جاتے ہیں

دشمنوں پر کبھی تکیہ کرنا  
اپنے سائے سے کبھی ڈر جانا

کاسہ سر کو نہ دی زخم کی بھیک  
ہم کو مجنوں سے بھی کم تر جانا

اس لیے اور بھی خاموش تھے ہم  
اہل محفل نے سخن ور جانا



پاس رہ کے بھی بہت دُور ہیں دوست  
اپنے حالات سے مجبور ہیں دوست

ترکِ الفت بھی نہیں کر سکتے  
ساتھ دینے سے بھی معذور ہیں دوست

گفتگو کے لیے عنوان بھی نہیں  
بات کرنے پہ بھی مجبور ہیں دوست

یہ چراغ اپنے لیے رہنے دے  
تیری راتیں بھی تو بے نُور ہیں دوست

سبھی پشمرده ہیں محفل میں شکلیب  
میں پریشان ہوں رنجور ہیں دوست

## پاداش

کبھی اس سبک رو ندی کے کنارے گئے ہی نہیں ہو  
تمہیں کیا خبر ہے  
وہاں اُن گنت گھر درے پتھروں کو  
سجّل پانیوں نے  
ملائم رسیلے مدھر گیت گا کر  
امٹ چکنی گولائیوں کو ادا سونپ دی ہے  
وہ پتھر نہیں تھا  
جسے تم نے بے ڈول اُن گھڑ سمجھ کر  
پُرانی چٹانوں سے ٹکرا کے توڑا  
اب اس کے سلگتے تراشے  
اگر پاؤں میں چُھ گئے ہیں  
تو کیوں چیختے ہو؟

## نظمیں

## اندمال

شام کی سیڑھیاں کتنی کرنوں کا مقتل بنیں  
 بادِ مسموم نے توڑ کر کتنے پتے سپردِ خزاں کر دیے  
 بہہ کے مشکیزہ ابر سے کتنی بوندیں زمیں کی غذا بن گئیں  
 غیر ممکن تھا ان کا شمار  
 تھک گئیں گننے والے ہر اک ہاتھ کی انگلیاں  
 ”ان گنت“ کہہ کے آگے بڑھا وقت کا کارواں  
 ان گنت تھے مرے زخمِ دل  
 ٹوٹی کرنوں، بکھرتے ہوئے زرد پتوں، برستی ہوئی بوندیوں کی طرح  
 اور مرہم بھی ناپید تھا  
 لیکن اس روز دیکھا جو اک طفلِ نوزائیدہ کا خندہ زیر لب  
 زخمِ دل مُندل ہو گئے سب کے سب!

## جہت کی تلاش

یہاں درخت کے اُوپر اُگا ہوا ہے درخت  
 زمین تنگ ہے (جیسے کبھی فراخ نہ تھی)  
 ہوا کا کال پڑا ہے، نمی بھی عام نہیں  
 سمندروں کو پلو کر، فضاؤں کو مٹھ کر  
 جنم دیے ہیں اگر چند ابر کے ٹکڑے  
 جھپٹ لیا ہے اُنھیں یوں دراز شاخوں نے  
 کہ نیم جان تنے کو ذرا خبر نہ ہوئی  
 جڑیں بھی خاک تلے ایک ہی لگن میں رواں  
 نہ تیرگی سے مفر ہے، نہ روشنی کا سوال  
 زمیں میں پاؤں دھسنے ہیں، فضا میں ہات بلند  
 نئی جہت کا لگے اب درخت میں پیوند

## دلاسہ

ہم ملے کب تھے  
 جدائی پر جو ہوں ویراں نگاہ و غم بجاں  
 بات میں ہو نرم بات  
 لب ہوں لب پر مہرباں  
 اس پہ کیا موقوف ہے ربطِ بہم کی داستاں  
 رہ گزارِ خاک پر  
 دور سے دو رویہ پیڑوں کی قطاریں  
 لاکھ آتی ہوں نظر  
 اپنے سر جوڑے ہوئے  
 درمیاں ان کے مگر  
 کب نہ حائل تھا غبارِ رہ گزر

ہم ملے کب تھے  
 جدائی پر جو ہوں ویراں نگاہ و چشمِ تر

## یاد

رات اک لڑکھڑاتے جھونکے سے  
 ناگہاں سنگِ سُرخ کی سیل پر  
 آئینہ گر کے پاش پاش ہوا  
 اور منہی نگیلی کرچوں کی  
 ایک بوچھاڑ دل کو چیر گئی



## جاگتی آنکھیں

کس کو گماں تھا اک نقطے کی آغوش اتنی کشادہ ہوگی  
جس میں آنت سرے تک رنگ بھری پہنائی  
گھل مل کر رہ جائے گی

کس کو خبر تھی انجانے پن کی گرد ایک لبادہ ہوگی  
جس کے تلے صدیوں کی سر بستہ دانائی

اپنی چھب دکھلائے گی  
کس کو یقین تھا دور کے لمس کی تاثیر اتنی زیادہ ہوگی  
جس سے سنگیں پیکر میں جامد رعنائی  
روح کی ندرت پائے گی

ایسی انہونی باتوں میں سچ کی کرنیں ٹانک چکا ہوں  
میں ان جاگتی آنکھوں کے گبیہر طلسم میں جھانک چکا ہوں

## گریز پیا

دھیرے دھیرے گر رہی تھیں نخل شب سے چاندنی کی پتیاں  
بہتے بہتے ابر کا ٹکڑا کہیں سے آ گیا تھا درمیاں  
ملتے ملتے رہ گئی تھیں مٹلیں سبزہ پہ دو پر چھائیاں  
جس طرح سپنے کے جھولے سے کوئی اندھے کنویں میں جا گرے  
ناگہاں کجلا گئے تھے شرمیلیں آنکھوں کے نورانی دیے  
جس طرح شورِ جبرس سے کوئی واماندہ مسافر چونک اٹھے  
یک بیک گھبرا کے وہ نکلی تھی میرے بازوؤں کی قید سے  
لب سلگتے رہ گئے تھے چھن گیا تھا جام بھی  
اور میری بے بسی پر ہنس پڑی تھی چاندنی

آج تک احساس کی چلمن سے اُلجھا ہے یہ مہم سا سوال  
اُس نے آخر کیوں بنا تھا بہکی نظروں سے حسیں چاہت کا جال؟

## لرزتا دیپ

دور شب کا سرد ہات  
 آسماں کے خیمہ زنگار کی  
 آخری قندیل گل کرنے بڑھا  
 اور کول چاندنی  
 ایک در بستہ گھروندے سے پرے  
 مضمحل پیڑوں پہ گر کر بچھ گئی

بے نشاں سائے کی دھیمی چاپ پر  
 اُونگھتے رستے کے ہر ذرے نے پل بھر کے لیے  
 اپنی پلکوں کی بچھتی درزوں سے جھانکا  
 اور آنکھیں موند لیں

اس سے طاقِ شکستہ پر لرتے دیپ سے  
 میں نے پوچھا:  
 ہم نفس!  
 اب ترے بچھنے میں کتنی دیر ہے؟

## سفیر

میں روشنی کا معنی، کرن کرن کا سفیر  
 وہ سیلِ مہ سے کہ رُودِ شرار سے آئے  
 وہ جامِ مے سے کہ چشمِ نگار سے آئے  
 وہ موجِ باد سے یا آبتار سے آئے  
 وہ دستِ گل سے کہ پائے فگار سے آئے  
 وہ لوحِ جاں سے کہ طاقِ مزار سے آئے  
 وہ قصرِ خواب سے یا خاکِ زار سے آئے  
 وہ برگِ سبز سے یا چوبِ دار سے آئے  
 جہاں کہیں ہو دلِ داغ دار کی تنویر  
 وہیں گھلیں مری بانہیں، وہیں کئے زنجیر

## عکس اور میں

آنچُو میں ایک طلسمی عکس اُبھرا تھا ابھی

دیکھے عارض..... آئینے میں تیز شعلوں کی ضیا  
احمریں لب..... زخمِ تازہ موجِ خوں سے آشنا  
تیکھے اُبرو..... لَوَحِ سیمیں پر دھوئیں کا خط کھنچا  
بکھرے گئیو..... کالی راتوں کا ملائم ڈھیر سا  
بہتی افشاں..... جگمگاتی مشعلوں کا قافلا  
گہری آنکھیں..... دُور تک منظر سہانے خواب کا

آنچُو میں اک طلسمی عکس اُبھرا تھا ابھی

نُقرئی پانی کے جو آنچل میں جھلمل کر رہی تھی، کون تھی  
حُور تھی تخیل کے رَمَنوں کی یا وہ جل پری تھی، کون تھی  
اس پہیلی کی گرہ کھلنے سے پہلے ہی نگاہوں پر مری  
ریشمیں قدموں کی آہٹ سے خلا کی سبز چلن آگری

آنچُو میں نرم لہروں کا خرامِ بے جرس  
یا کفِ ساحل پہ میرے نقشِ پا تھے اور بس!

## انفرادیت پرست

ایک انساں کی حقیقت کیا ہے  
زندگی سے اسے نسبت کیا ہے  
آندھی اُٹھے تو اُڑا لے جائے  
موج بھرے تو بہا لے جائے  
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے  
ڈگمگائے تو سہارا نہ ملے  
سامنے ہو پہ کنارا نہ ملے  
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے  
گند تلوارِ قلم کر ڈالے  
سرد شعلہ ہی بھسم کر ڈالے  
زندگی سے اسے نسبت کیا ہے  
ایک انساں کی حقیقت کیا ہے

## دعوتِ فکر

کس طرح ریت کے سمندر میں  
کشتی زیت ہے رواں سوچو

سُن کے بادِ صبا کی سرگوشی  
کیوں لرزتی ہیں پتیاں سوچو

پتھروں کی پناہ میں کیوں ہے  
آنہ ساز کی دُکان سوچو

اصل سرچشمہ وفا کیا ہے  
وجہ بے مہری بتاں سوچو

ذوقِ تعمیر کیوں نہیں مٹتا  
کیوں اُجڑتی ہیں بستیاں سوچو

فکرِ سُقراط ہے کہ زہر کا گھونٹ  
باعثِ عُمرِ جاوداں سوچو

لوگ معنی تراش ہی لیں گے  
کوئی بے ربط داستاں سوچو

## زاویے

رات تھی، میں تھا اور اک میری سوچ کا جال  
پاس سے گزرے تین مسافر، دھیمی چال

پہلا بولا..... مت پوچھو اس کا احوال  
دیکھ لو تن پر خون کی فرغل، خون کی شال

دوسرا بولا..... اور ہی کچھ ہے میرا خیال  
یہ تو خزاں کا چاند ہے، گھائل، غم سے ٹڈھال

تیسرا بولا..... بس یوں سمجھو اس کی مثال  
اندھیارے کے بن میں جیسے شب کا غزال

اُن کی روح تھی خود کالی، پیلی اور لال  
میرا وجود ہے ورنہ اب تک ایک سوال

## ہمارا دور

گلوں میں حُسن، شگوفوں میں بانگین ہوگا  
وہ وقت دُور نہیں جب چمن چمن ہوگا

جہاں پہ آج بگولوں کا رقص جاری ہے  
وہیں پہ سایہ شمشاد و نسترن ہوگا

فضائیں زرد لبادے اُتار پھینکیں گی  
عروں وقت کا زرکار پیرہن ہوگا

نسیم صبح کے جھونکے جواب دہ ہوں گے  
کسی کلی کا بھی ماتھا جو پُر شکن ہوگا

نئے اصول نئی منزلیں تراشیں گے  
یہ قافلہ مہ و انجم میں خیمہ زن ہوگا

بڑے سکون سے تعمیر زندگی ہوگی  
کہیں یزید نہ آذر نہ اہرن ہوگا

## شہرِ گل

کچھ نہ تھا شوخی رفتارِ صبا کا حاصل  
ناگہتِ گل کی پھواروں پہ کڑے پہرے تھے

چمپی بیل کے سیال نمو پر قدغن  
سرو و سوسن کی قطاروں پہ کڑے پہرے تھے

حلقہٴ برق میں اربابِ گلستاں محبوس  
دم بخود راہ گزاروں پہ کڑے پہرے تھے

دفعۃً شور ہوا، ٹوٹ گئیں زنجیریں  
زمزمہ ریز ہوئیں مہرِ بلب تصویریں

دو گھڑی کے لیے گھر گھر میں چراغاں سا ہوا  
جیسے ضوِ کاریِ انجم پہ کوئی قید نہیں

بند کلیوں نے تراشیدہ لبوں کو کھولا  
پھول سمجھے کہ تبسم پہ کوئی قید نہیں

بُنانِ عصر کے خالق کو باخبر کر دو  
نئے زمانے کا ہر فرد بُت شکن ہوگا

دُکھے دلوں کی خراشیں جو کرسکے محسوس  
اک ایسا صاحبِ دل صدرِ انجمن ہوگا

ہمارا دَور مساوات لے کے آئے گا  
ہمارے دَور میں ہر آدمی مگن ہوگا

گھنگریاں باندھ کے پیروں میں صبا اٹھلائی  
جیسے اندازِ ترمم پہ کوئی قید نہیں

یہ فقط خواب تھا، اس خواب کی تعبیر بھی ہے  
شہرِ گل میں کوئی ہنستی ہوئی تصویر بھی ہے

## خداوندانِ جمہور سے!

عُروسِ صبح سے آفاق ہمکنار سہی  
شکستِ سلسلہٴ قیدِ انتظار سہی

نگاہِ مہرِ جہاں تاب کیوں ہے شرمندہ  
شفق کا رنگِ شہیدوں کی یادگار سہی

بکھرتے خواب کی کڑیوں کو آپ چُن دتے  
کیا تھا عہد جو ہم نے وہ پائیدار سہی

ہجومِ لالہ و ریحماں سے داد چاہتے ہیں  
یہ چاک چاک گریباں گلے کا بار سہی

گنے جو زخمِ رگِ جاں شریکِ جشنِ حیات  
پیسے جو ساغرِ زہرابِ بادہ خوار سہی

چمن میں رنگِ طرب کی کوئی کمی نہ رہے  
ہمارا خونِ جگرِ غازہٴ بہار سہی

تھکن سے چور ہیں پاؤں، کہاں کہاں بھٹکیں  
ہر ایک گام نیا حُسنِ رہ گزار سہی

سُکوں بدوش کنارِ بھی اب اُبھر آئے  
سفینہ ہائے دل و جاں بھنور کے پار سہی

## نئی کرن

جہاں پناہ! سسکنے لگی چراغ کی لو  
شعاعِ تازہ سے چھلنی ہے سینہٴ ظلمات

بلند بام ہراساں ہیں رہ نشینوں سے  
اک ایسے موڑ پہ آئی ہے گردشِ حالات

جسے بھی دیکھیے لب پر سجائے پھرتا ہے  
زوالے دور کا قصہ اُچھوتے دور کی بات

جنہیں تھا حکمِ خموشی وہی پُکار اُٹھے  
ہمیں بھی اذنِ تبسم، ہمیں بھی اذنِ حیات

طلب ہوئی ہے جنہیں بے کراں اُجالوں کی  
سرابِ نجم و قمر سے بہل نہیں سکتے

نئی کرن سے اندھیروں میں برہمی ہی سہی  
نئی کرن کو اندھیرے نکل نہیں سکتے



جہاں پناہ! جمالِ سحر کی جوئے رواں  
افقِ افق کو درخشاں بنا کے دم لے گی

پلک پلک سے مٹائے گی داغِ اشکوں کے  
نظرِ نظر کو تبسمِ سکھا کے دم لے گی

خزاں رسیدہ چمن ہوں کہ ریت کے ٹیلے  
قدمِ قدم پہ شگوفے کھلا کے دم لے گی

ازل سے سینہ ویراں ہے منتظر جس کا  
نفسِ نفس وہی خوشبوِ رچا کے دم لے گی

## جشنِ عید

سبھی نے عید منائی مرے گلستاں میں  
کسی نے پھول پروئے، کسی نے خار چنے  
بنامِ اِذِنِ تَکَلُّمِ بنامِ جبرِ سکوت  
کسی نے ہونٹ چبائے، کسی نے گیت بئے

بڑے غضب کا گلستاں میں جشنِ عید ہوا  
کہیں تو بجلیاں کوندیں، کہیں چنار جلے  
کہیں کہیں کوئی فانوس بھی نظر آیا  
بطورِ خاص، مگر قلبِ داغِ دار جلے

عجب تھی عیدِ خمتاں، عجب تھا رنگِ نشاط  
کسی نے بادہ و ساغر، کسی نے اشک پئے  
کسی نے اطلس و کخواب کی قبا پہنی  
کسی نے چاکِ گریباں، کسی نے زخم سے

همارے ذوقِ نظاره كو عید كے دن بهى  
كهیں په سایہِ ظلمتْ كهیں په نور ملا  
كسى نے دیدہ و دل كے كنول كھلے پائے  
كسى كو ساغرِ احساس چكنا چور ملا

به فیضِ عید بهى پیدا هوئی نه يك رگى  
كوئی ملولْ كوئی غم سے بے نیاز رہا  
بڑا غضب ہے خداوندِ كوثر و تسنیم!  
كه روزِ عید بهى طبقوں كا امتیاز رہا

## لهو ترنگ

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء كے شهیدوں كى یاد میں!

(پہلى آواز)

همیں قبول نہیں زندگی اسیری كى  
هم آج طوق و سلاسل كو توڑ ڈالیں گے  
همارے دیس په اغیار حكمران كیوں هوں  
هم اپنے ہاتھ میں لوح و قلم سنبھالیں گے  
فضا مہیب سہی، مرحلے كٹھن ہی سہی  
سفینہ حلقہ طوفاں سے هم نکالیں گے  
نقوشِ راہ اگر تیرگی میں ڈوب گئے  
هم اپنے حوں سے ہزاروں دیے جلالیں گے

(دوسری آواز)

جو لوگ لے کے اُٹھے ہیں علم بغاوت کا  
انہیں خود اپنی ہلاکت پہ نوحہ خواں کر دو  
بجھاؤ گرم سلاخوں کو ان کی آنکھوں میں  
زبانیں کھینچ لو کڈی سے بے زباں کر دو  
ہدف بناؤ دلوں کو سلگتے تیروں کا  
سناں سے جسموں کو چھیدو شکستہ جاں کر دو  
محل سرا کی حدوں تک کوئی پہنچ نہ سکے  
ہر ایک گام پہ استادہ سولیاں کر دو

(پہلی آواز)

یہ غم نہیں کہ سردار آئے جاتے ہیں  
ہمیں خوشی ہے وطن کو جگائے جاتے ہیں  
ہمارے بعد سہی رات ڈھل تو جائے گی  
دلوں میں شمع جنوں تو جلائے جاتے ہیں  
ہمارے نقش قدم دیں گے منزلوں کا سراغ  
ہمیں شکست نہ ہوگی بتائے جاتے ہیں  
جواں رہیں گی ہمارے لہو کی تحریریں  
سدا بہار شگوفے کھلائے جاتے ہیں

## عید کی بھیک

حضور آپ مرے مائی باپ اُن داتا  
حضور عید کا دن روز تو نہیں آتا  
حضور آج تو نذرِ علیٰ نیازِ رسول  
حضور آپ کے گھر میں ہو رحمتوں کا نزول  
حضور آج ملے جان و مال کی خیرات  
حضور آپ کے اہل و عیال کی خیرات  
حضور احمدؑ مُرسل کی آئک کا صدقہ  
حضور فاطمہؑ زہرا کے لال کا صدقہ  
حضور آپ کی اولاد و آبرو کی خیر  
حضور آپ کے بیٹے کی اور بہو کی خیر  
حضور آپ کے بچے جنیں پھلیں پھولیں  
حضور آپ عزیزوں کی ہر خوشی دیکھیں  
حضور آپ کو مولا سدا سکھی رکھے  
حضور آپ کی جھولی خدا بھری رکھے  
حضور نامِ خدا کا خیر فرمائیں  
حضور آپ کے دل کی مُرادیں برآئیں

حضور! آج گداگر کو بھیک مل جائے  
حضور! کب سے کھڑا ہوں میں ہاتھ پھیلائے  
حضور! آنے دو آنے کی بات ہی کیا ہے  
حضور! آنکھیں چرانے کی بات ہی کیا ہے  
حضور! میری صداؤں پہ نور تو کیجئے  
فقیر یہ نہیں کہتا، گلے لگا لیجے

## بنامِ اہلِ چمن

چمن میں! اہلِ چمن! فکرِ رنگ و بو تو کرو  
بچھے بچھے سے شگوفوں کو شعلہ رو تو کرو

ابھی سے جشنِ بہاراں! ابھی سے شعلِ جُوں  
کلی کلی کو گلستاں میں سُرخرو تو کرو

یہیں پہ لالہ و گل کا ہجوم دیکھو گے  
خلوصِ دل سے بہاروں کی آرزو تو کرو

یہ کیا کہ گوشہٴ صحرا میں تھک کے بیٹھ گئے  
اگر قیام کرو، نزدِ آبِ جو تو کرو

گھنیری چھاؤں کی وادی یہیں کہیں ہوگی  
کڑکتی دھوپ میں سائے کی جستجو تو کرو

بلندیوں کے مینو، بہت اُداس ہیں ہم  
زمین پہ آ کے کبھی ہم سے گفتگو تو کرو

تمهيس بهى علم هو اهل وفا په كيا گزرى  
تم اپنے خونِ جگر سے كبهى وضو تو كرو

نہیں ہے ريشم و كخواب كى قبا، نه سہى  
ہمارے دامنِ صد چاك كو رُفو تو كرو

نگارِ صبحِ گريزاں كى تابشوں كو كبهى  
ہمارے خانہِ ظلمت كے رُو برو تو كرو

طلوعِ مہرِ درخشاں ابھى کہاں يارو  
سياهیوں كے اُنق كو لہو لہو تو كرو